Al-Behishat Research Archive
ISSN Online: 3006-5224
ISSN Print: 3006-5216

Publisher: Al-Behishat Education & Research Institute
Journal Frequency: BI-Annual

A PSYCHOLOGICAL STUDY OF MUHAMMAD MANSHAYAD'S STORIES

محمد منشایاد کے افسانوں کا نفسیاتی مطالعہ

Dr. Parveen Kallu
Associate Professor Urdu Department , Government College University Faisalabad
Dr. Mamuna Subhani
Associate Professor, Urdu Department G.C University Faisalabad
(memunasubhani@gcuf.edu.pk)
Sajeela Urooj
M.Phil Research Scholar Urdu Department, University of Lahore, Sargodha campus

Abstrcat

Muhammad Mansha Yaad is one of the famous short story writer in Pakistan. He highlighted the core issues of Pakistani society in his stories. He wrote on the rural issues and on the lack of facilities in rural area as well he also wrote on the city life and on the darker sides under the lights. Mansha yaad proofs himself through his style and the selection of the topics. He belongs to a village situated in Punjab is one of the reason that he portrayed beautifully the social issues of the rural life in his short stories. He wrote on lot of social issues such as politics, literature, religion, urban and rural problems, poverty, and on many more. His style of writing is as unique as the critic of the Urdu literature like his way of writing. Mansha Yad has vividly depicted the social oppression and the paralysed state of rural life among the farmers, the downtrodden and the middle classes in his stories.The poor farmers, peasants or the lowly living in the villages who are victims of the oppression of the Chaudhrys and the landlords and who cannot do anything for their rights according to the whims of the people. He has tried to awaken the suppressed spark. These all factors have been discussed in his story Collection "Maas aor Mitti".
Key Words: Muhammad Mansha Yaad, issues of Pakistani society, village situated in Punjab, Chaudhrys, landlords, "Maas aor Mitti".

منشا یاد کے افسانے جو شدت احساس اور کرداروں کی غیر معمولیت سے ممیز ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں مارشل لاء کے تاریک ترین دور میں منظر عام پر آنے والے دیہی زندگی کے مسائل کے ساتھ ساتھ سیاسی سطح پر درپیش مسائل کو بھی بڑی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ان کے مجموعے "ماس اور مٹی" کتاب کی تعارفی تقریب میں ڈاکٹر وزیر آغا نے ان جملوں سے اپنے خطاب کا آغاز کیا:

"آج کی یہ شام " ماس اور مٹی" کے نام ہے مگر میری رائے میں افسانوں کے
اس مجموعے کو محض ایک شام الاٹ کر کے ٹرخایا نہیں جا سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ

اس قسم کا مجموعہ تو کہیں سالوں کے بعد منظر عام پر آتا ہے اور بعض تو پوری
دہائی کا ایک اہم ادبی واقعہ قرار پاتا ہے''۔(۱)

"راستے بند ہیں" اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ایک بھوکے اور افلاس زدہ شخص کے ذائقوں کا شہر آشوب ہے جس کے بس میں کچھ بھی خریدنے کی سکت نہیں ہے۔ یہ شخص اتنا ہی بھوکا ہے جتنا کہ خواہش کے اندھے کنویں کا بھکاری بازاری کتا۔ کہانی کا مرکزی کردار جس کا کوئی نام نہیں ہے اپنے ہم زاد کے ساتھ میلہ دیکھنے آیا ہوا ہے اور اُسکی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ میلے میں سب کچھ ہے مگر اس کے لئے کچھ بھی نہیں ہے وہ بس دیکھنے اور ترسنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے۔ لوگوں کے سامنے اس طرح اکڑوں بیٹھ جاتا ہے جیسے ایک بھوکا کتا۔ پھر اسے بتایا جاتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے یا کھایا پیا جا رہا وہ انسان کی مشترکہ لذت ہے۔ اس لئے جب وہ کسی کو قلاقند کھاتا دیکھے تو یہ سمجھے کہ وہ خود قلاقند کھا رہا ہے۔ اس نے اس خود فریبی پر عمل کیا اور انجام کار آخر میں ایک آدمی کو ٹرک کے نیچے کچلا ہوا دیکھتا ہے اور خود بھی وہی پھڑک کر ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ افسانے کا موضوع معاشرتی جبر ہے۔ آج کے معاشرے میں غریب آدمی اپنا تشخص کھو چکا ہے۔ وہ بے بسی، ناامیدی لاچاری اور مجبوری کی انتہا تک پہنچ چکا ہے۔ کردار کا میلے میں موجود ہونا دراصل اس مادی دنیا میں موجودگی کو ظاہر کرتا ہے۔ میلہ ہی دراصل یہ مادی دنیا ہے۔ اور کردار کا ہم زاد اس کے اندر کا ضمیر ہے جو اسے بار بار جرم کرنے سے روکتا ہے۔ اُسے ایسی حرکتوں سے باز رکھتا ہے۔

''اس نے کئی بار ارادہ کیا ہے کہ کسی حلوائی کی دکان یا کسی ہوٹل میں گھس کر جی بھر کر کھائے اور خود کو دکان دار یا پولیس کے حوالے کر دے لیکن میں نے ہر لمحہ اسے ایسی حرکتوں سے باز رکھا ہے۔''

معاشرتی ناانصافی افراد کے اندر بے بسی کو جنم دیتی ہے۔ جو ان کے تشخص کو کچل کر انہیں مجبور محض تماشائی بنا دیتی ہے۔ افسانے میں جزئیات نگاری کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ میلے کی مناسبت سے میلے میں موجود تمام اجزاء کا ذکر جامع اور مفصل انداز میں کیا گیا ہے۔ مکالماتی انداز اختیار کیا گیا ہے افسانے کے مرکزی کردار اور اُس کے ہمزاد (ضمیر) کے

باہمی مکالمات نے افسانے میں کش مکش اور تناؤ کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ داخل اور خارج کی باہمی کشمکش سے مجبوری کی فضا پیدا ہوئی ہے۔

اس مجموعے کا دوسرا افسانہ '' کچی پکی قبریں'' ہے۔ جو ایک طرف معاشرتی عدم مساوات کا نوحہ ہے تو دوسری طرف کوڈو فقیر کی خاموش محبت اور بولتے ہوئے احتجاج کی کہانی ہے وہ اکیلا قبرستان کے ایک کونے میں اپنی آبائی جھونپڑی میں رہتا ہے۔ قبرستان میں بھی وہی گاؤں والا امتیازی ماحول ہے۔ امیر لوگوں کی قبریں اچھی اور بلند جگہوں پر اور غریب لوگوں کی نشیب میں۔ پکی قبروں پر دیئے جلتے ہیں اور قرآن خوانی ہوتی ہے اور کچی قبر میں ان سب چیزوں سے محروم رہتی ہیں۔ وہ روزانہ شام کو گاؤں میں بھیک مانگنے جاتا ہے۔ بھیک مانگتے مانگتے اُس کے دل میں چوہدری بخشے کی بیٹی نوراں کے عشق کی آگ دہکنے لگتی ہے۔ وہ روزانہ بھیک مانگنے کے بہانے نوراں کا دیدار کرنے جاتا ہے۔

'' ایک روز کیا دیکھتا ہے کہ چودھری بخشے کی حویلی مہمانوں سے بھری پڑی ہے۔۔۔اسے چولہوں میں ایند ھن جھونکنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ وہ آگے بڑھتا ہے لیکن ٹھٹک کر رہ جاتا ہے۔ دیگوں کے نیچے بڑے بڑے چولہوں میں لکڑیوں کی جگہ دھڑ دھڑ اس کے بازو اور ٹانگیں جل رہی ہیں۔''

وہ انہیں حقارت سے روندتا ہوا قبرستان کی طرف بڑھتا ہے۔ اس طبقاتی تفاوت اور اپنی محبت چھن جانے کے بعد گورکن کوڈو فقیر نہ صرف انوکھا احتجاج کرتا ہے بلکہ چوہدری فضل اور نمبردارن روشن بی بی کی قبروں سے ہڈیاں نکال کر اپنے ماں باپ کی قبروں میں موجود ہڈیوں سے بدل کر حویلی والوں سے انتقام بھی لے لیتا ہے۔

افسانے کا انجام جو انتقام کی صورت لئے ہوئے ہے قاری کو چونکا دینے والا ہے گو کہ محبت ایک فطری جذبہ ہے جو ذات پات اور امیر غریب کے فرق سے بے نیاز ہے۔ مگر اپنی محبت کو نہ پاسکنے کا اس طرح انتقام، قاری کوڈو فقیر کی اس جرات پر حیران رہ جاتا ہے۔ قبرستان کے ماحول نے افسانے کی معنویت اور تاثر کو اور گہرا کر دیا ہے۔ آج کے معاشرے میں انسان واقعی قبرستان میں ہی رہ رہا ہے۔ جہاں انسان ایک دوسرے سے لاتعلق اپنی اپنی دنیا میں کوڈو فقیر کی طرح بوٹی پی کر مست رہتے ہیں۔ دیہی معاشرت کی عکاسی بڑی خوبصورتی سے ہوئی ہے، نوراں کی شادی کا بیان، قبرستان

Al-Behishat Research Archive
https://al-behishat.rjmss.com/index.php/20/about

میں جمعرات کو خاص اہتمام بستی میں مانگنے والے فقیر کا وہ لمبا تھیلا کالو اور ڈبو کا ہر وقت ساتھ رہنا سب دیہی معاشرت کی بھرپور عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔

پانی میں گھرا ہوا پانی نادار مفلس، جنسی طور پر کمزور، ایک بانجھ آدمی کا قصہ ہے۔ جو چکنی مٹی کے گھنگھو گھوڑے، بیل بندر بناتے بناتے ایک دن " باوا بناتا ہے اور اُسے دھوپ میں سوکھنے کے لئے رکھ دیتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ڈتے نام کا ایک کمہار ہے۔ زنیاں اُسکی بیوی، جسے وہ ایک بھینس اور گدھی کے عوض خریدار کر لایا ہے۔ زنیاں بہت خوبصورت ہے۔ اس بات کا دونوں میاں بیوی کو احساس ہے۔ زنیاں کھاری سر پر رکھے گاؤں بھر میں گھنگھو گھوڑے بیچنے نکلی ہے۔ ڈتے کو زنیاں کی طرف سے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے۔ گاؤں والے اُسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں:۔

"میں نے باد وابنایا ہے، باو؟ ہاں باوااور ایسا بنایا ہے کہ بس جان ڈالنے کی کسر رہ گئی ہے تم دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی کہ دنیا میں تم سے زیادہ خوبصورت چیزیں بھی ہیں بنائی جاسکتی ہیں"۔ "اچھا چلو دکھاؤ۔ وہ اشتیاق سے بولی۔ وہ اُسے لے کر وہاں آیا۔۔۔۔ گھوڑے، بیل، بندر اور سب چیزیں جوں کی توں پڑی تھیں مگر آدمی وہاں نہیں تھا۔"

باوا گم ہو جانے کے بعد گاؤں کے لوگ اُس کا مذاق اڑاتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ سب بھول گئے مگر وہ نہ بھول سکا۔ زنیاں نے رمجے دُکاندار سے تعلق استوار کر لیئے۔ پھر ایک موسم برسات میں آسماں سے اتنا پانی برسا کہ ہر طرف جل تھل ہو گیا جس سے کلر زدہ زمین میں گھاس اُگ آئی پھر ایک صبح ڈتے کے گھر سے چلم کے لئے جلائے گئے اُپلوں کا دھواں اور زنیاں کی چیخیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ اُس نے ایک ناجائز بچے کو جنم دیا۔ منٹو جنس اور منشایاد کے عنوان سے نقاد محمد حمید شاہد نے اس افسانے کا جنسی نقطہ نظر سے مطالعہ پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> "منشا یاد کے جنسی حسیت کے یہ افسانے (بند مٹھی میں جگنو، پانی میں گھرا ہوا پانی) بھی دھپ سے میرے دھیان کی چھت پر اترتے رہے ہیں۔ یہ افسانے زیر نظر موضوع کے حوالے سے یوں بھی لائق اعتنا ہیں کہ صنفی اشتہا انگیزی

> میں طاق اور جنسی گمراہی سے لذت گیری کے حصول میں مگن نہ ہوتے
> ہوئے بھی یہ تخلیقی اور تکنیکی سطح پر اتنے اہم ہو گئے ہیں کہ فکشن کا قاری ان
> سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔"(۲)

افسانے میں کرداروں کی زبان سے بیان کئے گئے جملے اپنے اندر گہری معنویت رکھتے ہیں۔ڈتے کو اپنے اندر پائی جانے والی کمی کا احساس ہے اور وہ ہر روز زنیاں کو گھر میں موجود پا کر حیران ہوتا ہے اور زنیاں لاکھ حسین سہی مگر اُسے بھی یہ احساس ہے کہ وہ ایک بھینیں اور گدھی کے عوض خریدی ہوئی چیز ہے اور اُسے ہر حال میں یہیں رہنا ہے۔نفسیاتی سطح پر یہ ایک پیچ دار کہانی ہے۔مٹی کے باوئے" کو علامت بنا کر انسان کے گم ہو جانے کی روداد بیان ہوئی ہے۔دیہی ماحول و معاشرت کی عکاسی خوبصورت انداز میں بیان ہوئی ہے۔ڈتے کمہار کا اضطراب اور بے چینی حقیقی ہے۔ مگر وہ حقیقت حال معلوم ہو جانے کے بعد کوئی جارحانہ رویہ اختیار نہیں کرتا بلکہ پھٹی پھٹی نظروں سے بس دیکھتا رہ جاتا ہے اور اوزار اُٹھا کر باہر نکل جاتا ہے۔

"اپنا گھر"اس مجموعے کا چوتھا افسانہ ہے۔اس افسانے میں شہری زندگی کی منفی قدروں پر بھرپور طنز ملتا ہے۔ جس میں شہری اور دیہی تجربے کا تصادم، شخصیت کو دولخت کر دیتا ہے۔زندگی کی یکسانیت تصنع اور روٹین سے اکتائے ہوئے شخص کی کہانی جو سادگی کی تلاش میں دیہات کا رخ کرتا ہے مگر شہری زندگی کے سارے لوازمات اور تکلفات ہمراہ لے کر۔کہانی کا مرکزی کردار اور اُسکی بیوی دونوں اپنی اپنی زندگی کی ایک جیسی روٹین سے تنگ آ چکے ہیں۔بلا آخر دونوں متفقہ طور پر فیصلہ کرتے ہیں کہ ان دونوں کو بچوں سمیت کچھ دن اپنے آبائی گاؤں میں گزار آنے چاہئیں تاکہ یکسانیت بھری زندگی میں کوئی نئی تبدیلی محسوس کریں۔گاؤں جانے کی تیاری شروع ہوتی ہے اخراجات کا تخمینہ لگایا جاتا ہے ریل گاڑی کی سیٹیں بک کروائی جاتی ہیں۔گھر کی رکھوالی کے لئے ایک قابل اعتماد شخص کو چوکیدار کے طور پر رکھا جاتا ہے۔

جس روز انہیں گاؤں جانا ہوتا ہے اُسی رات بارش ہو جاتی ہے سفر میں دشواری کے پیش نظر ریل کے ٹکٹ واپس کرائے جاتے ہیں اور دو روز بعد کی سیٹیں بک کرائی جاتی ہیں۔ مگر اسی شام کو اچانک گاؤں سے بزرگوار تشریف لے آتے ہیں۔ ان کو معمولی اور میلے کچیلے کپڑوں میں دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ سلام دُعا کے بعد پوچھتے ہیں تو وہ بتاتے ہیں:۔

" آج صبح تلائی کرتے ہوئے اچانک تم لوگوں اور بچوں کو دیکھنے کے لئے دل تڑپا میں نے گھر جا کر تمہاری والدہ کو اطلاع دی۔ کرایہ لیا اور چلا آیا۔۔۔ سوچا اپنے ہی گھر تو جا رہا ہوں۔"

غرض آپ نے پر تکلف اور مصنوعی زندگی کے عادی ایک شخص کا رویہ ملاحظ فرمایا وہ چھوڑ کر جانا چاہتا ہے۔ مگر شہر کو اپنے ساتھ اُٹھا لیتا ہے اور پھر کہیں پہنچ نہیں پاتا بس خلا میں معلق رہ جاتا ہے۔ مگر جو سچ مچ کے مخلص اور سادہ لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے رویوں میں سادگی اور بے ساختگی ہوتی ہے۔ وہ بناوٹ اور تصنع سے پاک رویوں کے حامل ہوتے ہیں باپ اور بیٹے کے رویوں میں یہ تبدیلی دراصل قدیم و جدید دور کی تبدیلی ہے۔ جس نے خاندان کی اکائی کو توڑ کر رکھا دیا ہے۔ جدید معاشرے کا فرد ایک مسلسل بدلتے ہوئے تناظر کی زد میں ہے۔ پرانی دنیا کے خاتمے نے اسے ذہنی طور پر یاسیت کے خلا میں پھینک دیا ہے۔ وہ تشکیک میں مبتلا ہو گیا ہے۔ نظریاتی سطح پر بھی بیسویں صدی کے شہری کو کئی محاذوں پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے جس سے اس کے اعتماد اور یقین پر کاری ضرب لگی اور یاسیت کے غبار نے اسے چاروں طرف سے اپنے نرغے میں لے لیا ہے۔ وہ مایوسی اور ناامیدی کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گیا ہے۔ غرض یہ کہ جدید دور کے اُردو ادب میں یاسیت اور بے معنویت کا احساس کسی نہ کسی حد تک موجود ہے مگر جدید اردو افسانہ نگاروں کے ہاں اس قسم کے جذبات کا اظہار ملتا ہے جو فرد کی یاسیت اور قنوطیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ منشایاد کے افسانے اپنا گھر میں یاسیت اور قنوطیت کی مثال ملاحظہ فرمائیں:۔

ایک جیسی صبحیں ایک جیسی شامیں۔۔۔ وہی گھر وہی آنگن۔ وہی شہر اور سڑکیں۔۔۔ وہی ہر طرف مداریوں کی طرح چتر چالاک آدمی اور آسمان میں تھگی لگانے والی بارہ تالن عورتیں۔۔۔!۔۔۔۔۔ وہی ہر روز ایک ہی طرح سو

کراٹھنااور وہی ستر ستر قدم پیچھے ہٹ کرایک دوسری سے ٹکریں مارتی گھر کی دیواریں۔ بھاگم بھاگ دفتر کے لئے تیار ہونا۔۔۔وہی میز اور وہی ایک جیسا ناشتہ۔۔۔۔باہر سے تھک کر گھر آنااور گھر سے اکتا کر باہر نکل جانا۔"

باجی بگھیلی رات جاگیر دارانہ معاشرے کے جبر اور محبت کے ازلی فراق کا افسانہ ہے چودھری برداری کا ایک گھرانہ دوسرے گھرانے کی بھیڑ چوری کر کے سجاول موچی سے ذبح کرواتا ہے۔چوری ثابت ہو جانے کے بعد حتمی فیصلے کے لئے گواہی کا بار سجاول موچی کے سر آن پڑتا ہے۔اُسے کچی گواہی دینے سے روکا جاتا ہے۔بیٹی کہتی ہے ابا! اگر تم نے جھوٹی گواہی دی تو تم خدا کو اور میں اپنی سہیلیوں کو کیا منہ دکھاؤں گی۔میں نے ہمت بڑھاتے ہوئے کہا کتاب میں لکھا ہے سانچ کو آنچ نہیں سجاول نے جواب دیا وہ کتابی باتوں پر عمل نہیں کرنے دیں گے نہ ہی انہوں نے کتابیں پڑھی ہیں۔ مجھ سے صاف سیدھا سچ نہ بلواؤ درمیان کا کوئی راستہ بتاؤ۔

" وہ خود بھی حیران تھا کہ کب اور کیسے اُس نے سچ کے زہر کا پیالہ منہ سے لگالیا۔باہر آکر اُس نے اُن سے معافی مانگنا چاہی مگر انہوں نے بھیڑیوں جیسے منہ پھاڑ کر کہا" تمہارے اپنے گھر میں بھی بھیڑ ہے اب دیکھتے ہیں تم اُسے کیسے بچاتے ہو"۔

افسانے کا اہم نسوانی کردار سجاول موچی کی جوان بیٹی، جیسے چودھریوں کے ڈر سے پڑوسیوں کے گھر میں چھپا دیا جاتا ہے۔اس کے گھر والوں کا اصرار تھا۔کہ وہ اپنے ماموں کے بیٹے سے شادی پر رضا مند ہو جائے مگر وہ کسی طور پر مانتی نہ تھی۔محبت اور سچائی کی ایک دردانگیز اور متاثر کن کہانی،خونخوار بھیڑیوں میں گھری ہوئی ایک بھیڑ ایسی معصوم لڑکی کی کہانی جو اپنے محبوب سے دل کا حال بھی نہ کہہ سکی اور بلاآخر اپنی مرضی کے خلاف شادی کرنے پر رضا مند ہوگئی۔

منشایاد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے محبت کی ایک عام سی کہانی کو انوکھے انداز میں بیان کر کے ہمیشہ کے لئے امر کر دیا ہے۔ جاگیر دارانہ جبر کی قید چالیس راتوں پر جبکہ ہمارے سماج اور معاشرے کا جبر اسکی پوری زندگی پر محیط ہے۔جہاں اُس سے محبت کرنے کا حق چھین کر رسم و رواج اور جھوٹی عزت کی قسمیں دے کر اسکی پوری زندگی کو نرخ بنا دیا جاتا ہے۔

مظفر علی سید لکھتے ہیں:

''باگی تھیلی رات میں ایک روایتی دیہاتی صورت حال کو خواب کی طرح بیان کیا گیا ہے لیکن یہ خواب آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہے۔''(۳)

دیہی معاشرت کی عکاسی کا علمبردار یہ افسانہ اپنے اندر تمام تر جزئیات لئے ہوئے ہے۔ جہاں دولت کے زور پر کوئی بھی دن دیہاڑے قانون کو ہاتھ میں لے سکتا ہے۔ اور اگر بدلہ یا انتقام لینا ہے تو پھر نظر گھر کی چار دیواری میں بستے نفوس پر جاتی ہے۔ اور حویلی والوں کی پگڑی کے اونچے شملے ان ہی نفوسوں کی بے لوث قربانیوں کے باعث ہوتے ہیں۔ منشا یاد کے افسانوں کی عورت ہمیشہ ہی بے لوث قربانی دیتی آئی ہے۔ خاندان اور رشتوں سے جڑی یہ عورت اپنی انہی قربانیوں کے باعث وقار پاتی ہے۔ اور منشا یاد کو یہ وقار بہت عزیز ہے تب ہی تو وہ اتنا کچھ بڑے آرام سے سہہ جاتی ہے اور جاتے جاتے وعدہ بھی لے لیتی ہے اس کا ذکر اور انتظار اب فضول ہے۔ وعدہ کرو تم بھی اب اس کا ذکر کبھی نہیں کرو گے''۔ ہائے میں ایسے مار مکائیاں دیسوں دور کرائیاں''

''ماس اور مٹی'' اس مجموعے کی چونکا دینے والی اور سنسنی خیز کہانی ہے۔ کرداروں میں مرکزی کردار ناتو سانسی کا ہے۔ ناتو سانسی کہانی ''راستے بند ہیں'' کا وہ بے نام کردار ہے۔ جسے میلے میں موجود صرف کھانے پینے کی چیزوں سے غرض ہے۔ ناتو سانسی بھی کئی صدیوں کا بھوکا ہے وہ اپنی بھوک مٹانے کے لئے چوری چکاری اور سینہ زوری سے کام لیتا ہے۔ دوسرا کردار شیرو کا ہے جو ناتو کا باپ ہے۔ شیرو دارو پی کر اور حقہ لے کر دیوار کے ساتھ بیٹھا رہتا ہے اور ساتھ ہی گدھوں کی پرواز کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ شیرو مردار کھاتا ہے۔ اُسے جیسے ہی کسی مردہ جانور کا پتہ چلتا ہے وہ اُس کا بہت سا گوشت کاٹ کر لے آتا ہے اور انگاروں پر بھون کر کھا جاتا ہے لیکن ناتو اپنے باپ کی طرح مردار نہیں کھاتا اُسے تازہ گوشت اچھا لگتا ہے۔ وہ ڈربوں سے مرغیاں اور باڑوں سے بھیڑ بکریاں اُٹھا لے جاتا ہے اور انہیں مار کر کھا جاتا ہے ناتو کی ماں عالمے اور بہن مادو گاؤں سے بھیک مانگ کر لاتی ہیں شیرو عالمے اور مادو کی لائی ہوئی بھیک سے پیٹ بھر لیتا مگر خود

Al-Behishat Research Archive
https://al-behishat.rjmss.com/index.php/20/about

بھیک نہیں مانگتا، مانگ ہی نہیں سکتا۔ لوگ ناتو سے ڈرتے ہیں اکیلا و کیلا آدمی اس سے الجھنے سے گریز کرتا ہے ناتو کئی بار اپنے باپ کو دھمکی دے چکا ہے کہ وہ اُس کی شادی کر دے ورنہ وہ خود کوئی عورت اُٹھا کر لے آئے گا یا شہر چلا جائے گا۔

منشایاد کو خطوط لکھے گئے اور اُن سے کہا گیا کہ وہ اس افسانے کا کچھ حصہ ہلکا کر دیں مگر منشایاد نے انکار کر دیا۔ جب معاملہ طول پکڑنے لگا تو منشا یاد نے کہانی میں تبدیلی تو کر دی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اصل حقیقت وہی ہے جس پر اعتراض ہوا ہے۔ کہانی کا اصل متن اور اس کے روبرو تبدیل شدہ حصہ دونوں شامل کئے جا رہے ہیں۔

اصل متن:

''اگر اس کے ڈسوانے کے دن نہ ہوتے تو وہ ناتو کو مادو کے پاس کبھی نہ جانے دیتی۔ مگر اب وہ ایک ہی ٹھوکر کھا کر اُٹھنے کے قابل نہ رہی تھی، وہ مادو کے لحاف سے نکل کر یوں بھاگا جیسے اسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔

''شیر و نے آگ پر گوشت بھونتے اور حقہ گڑ گڑاتے ہوئے ہنس کر پوچھا کیوں ناتو کیا دیکھا تم نے؟ یہ رب کی قدرت ہے پتر۔''

بابا وہ عورت نہیں ہے وہ ہانپ رہا تھا وہ عورت ہے نہ مرد۔ بابا وہ تو کچھ بھی نہیں۔''

شیر و پھر ہنسا اور کہنے لگا

''جب رب اسے بنانے لگا تو مٹی کم پڑ گئی، رب کو اور بہت سے کام ہوتے ہیں،

''اس نے اور بہت کچھ بنانا ہوتا ہے۔''

تبدیل شدہ متن

''اگر اس کے ڈسوانے کے دن نہ ہوتے تو عالمے ناتو پر مادہ کا راز کبھی نہ کھلنے دیتی۔ مگر اب ناتو مادو کو گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔۔۔ پتہ نہیں وہ اسے کہاں بیچ دے اور اس کے بدلے میں اپنا بیاہ رچا لے۔۔۔ عالمے نے اسے

Al-Behishat Research Archive
https://al-behishat.rjmss.com/index.php/20/about

روکنے کی کوشش کی تھی مگر ایک ہی دھکا کھا کر اُٹھنے کے قابل نہ رہی تھی۔ ناتو کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر شیر وسے نہ رہا گیا وہ پٹی سے ہنس کر بولا:

"اسے نہ لے جا۔۔۔ ناتو۔۔۔ یہ عورت نہیں ہے"

"عورت نہیں ہے؟ ناتو کو جیسے سانپ نے ڈس لیا۔"

"ہاں پتر۔۔۔ یہ رب کی قدرت ہے۔۔۔ یہ عورت ہے نہ مرد یہ تو کچھ بھی نہیں ہے"

پھر اس نے آگ پر گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے بھونتے ہوئے آسماں کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی آہ بھر کر بولا:

"جب رب اسے بنانے لگا ہٹی کم پڑ گئی۔۔۔۔ رب کو اور بہت سے کام ہوتے ہیں اُس نے اور بہت کچھ بنانا ہوتا ہے۔"

افسانے میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں جس اختصار اور ایجاز سے کام لیا گیا ہے اس نے اسے اور بھی موثر بنا دیا ہے۔ منشا یاد نے بھکاری اور شودر ذات سے تعلق رکھنے والے ان کرداروں کی نفسیاتی کیفیت بڑی خوبصورتی سے واضح کی ہے۔ حیوانوں سے بدتر زندگی گزارنے والے یہ لوگ آج کے دور میں بھی حیوانی اصولوں پر عمل پیرا ہیں۔ وہ کسی اخلاقی ضابطے اور قانون کی پاسداری نہیں کرتے، مردار کھانے اور غیر فطری زندگی گزارنے کی وجہ سے ان کو لنگڑے، سانس، چمار اور چوہڑے کہا جاتا ہے۔ اور اکثر ان ہی لوگوں کے ہاں اس طرح کے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ گھر سے باہر ایک دن اس مجموعے کا ساتواں افسانہ ہے۔ گہرے مشاہدے کا حامل یہ افسانہ اپنے اندر معاشرتی بے رحمی اور بے حسی کا تاثر لئے ہوئے ہے عرصے سے گھر کے ماحول میں مقید بے روزگار نوجوان حالات سے مجبور ہو کر اپنے پڑوسی

علی احمد کی ہدایت پر گھر سے باہر قدم نکالتا ہے۔ مگر گھر کی دہلیز سے آگے خلاء تھا۔ وہ دور تک مکڑی کی طرح اپنے ہی تاگے سے لٹکتا چلا گیا۔ پتہ نہیں زمین کہاں تھی۔۔۔ تھی بھی یا نہیں۔

"اس کی بیوی۔۔۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کر رو پڑی۔ اس نے کہا بھاگوان یہ رونے کا نہیں خوش ہونے کا موقع ہے میں حادثے میں مر بھی تو سکتا تھا لیکن میں زندہ ہوں۔ اُٹھو اور شکرانے کے نفل ادا کرو۔"

کردار کی نفسیاتی کشمکش عجیب طرح کی ہے وہ نہیں جانتا وہ کیا اور کیوں کر رہا ہے۔ افسانے کی فضا اداسی اور ناامیدی کا عکس لئے ہوئے ہے۔ جو معاشرہ فرد کی ترقی اور تحفظ کا ضامن ہونا چاہیئے اُس نے فرد کو پسماندگی اور غیر محفوظ تحفظ کا شکار بنا رکھا ہے۔ بروقت فائل سے درخواست نکال کر پھاڑ دینا کردار کے حس ادراک کا پتہ دیتا ہے۔ وہ قابل دید ہے اس افسانے کا شمار عالمی سطح کے اُن افسانوں میں ہوتا ہے جن میں گہرے مشاہدے اور درد مند تخلیقی احساس ، سماجی ناہمواریوں، معاشرتی تضادات، اور زمین پر موجود بدانتظامیوں کا شکار مخلوق کے کرب کو کمال خوبی اور نہایت شدت سے پیش کیا جاتا رہا ہو۔ مظفر علی سید لکھتے ہیں:

> "گھر سے باہر ایک دن جدید شہری زندگی کی بے چارگی کا نقشہ دکھاتا ہے لیکن آخری فقرہ ہجو ملیح کے لہجے میں صبر و رضا کی تلقین کرتا ہے۔ یہی زہر خندا فسانے کے اندر بھی ایک حد تک موجود ہے۔" (۴)

نئی دستک اس مجموعے کا آٹھواں افسانہ ہے۔ مرکزی کردار جمی اور اُس کے باپ کا ہے۔ جمی اپنے ذہن میں اُٹھنے والے سوالوں کا اپنے باپ سے جواب چاہتا ہے اور باپ ان سوالوں کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ جمی کی صورت میں نئی نسل کے ذہنی انتشار کی عکاسی کی گئی ہے۔ جمی کے پہلے دو سوال طبقاتی تقسیم اور معاشرتی ناہمواری کے بارے میں ہیں۔ جمی کا تیسرا سوال چائلڈ ابیوز (Child Abuse) کے بارے میں ہے اور چوتھا سوال جس کا جواب جسمی خود ہی دیتا ہے۔

Al-Behishat Research Archive
https://al-behishat.rjmss.com/index.php/20/about

''ابو یہ جو بچا عبدل ہیں جن کی شادی ہے انہوں نے اکبرے کو قتل کیا تھا۔۔سب کے سامنے مارا تھا۔'' جمی نے کہا پھر پولیس پکڑ کر لے گئی۔۔۔۔

ابو آپ کو پتہ نہیں تھا اس لئے آپ نے انہیں جیل سے رہا کرایا ہے نا''!

''ہاں بیٹے مجھے پتہ نہیں تھا پولیس کو بھی پتہ نہیں تھا۔''

یہ افسانہ بیانیہ اور مکالماتی انداز بیاں میں بیان ہوا ہے۔اُسلوب رواں اور سوالیہ انداز کا حامل ہے۔افسانے میں اس اہم پہلو کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ نئی نسل زیادہ باشعور ہے جو معاشرتی برائیوں کو بڑی شدت سے محسوس کر رہی ہے۔ اور نئی نسل بے چینی اور بے اطمینانی کا شکار ہو رہی ہے۔ طبقاتی ناہمواری، ناانصافی اور بداعمالی افراد کی نفسیات کو بُری طرح متاثر کر رہی ہے۔

اسلم سراج الدین لکھتے ہیں:

> ''منشایاد بذات خود اپنے سوالات کے ساتھ نئی دستک'' کے جمی کے روپ میں سامنے آتا ہے۔اس افسانے میں رمز یہ پنہاں ہے کہ سوالات اُٹھانے والا جمی بھی مصنف منشایاد ہے اور سوالات کو ٹالنے والا بیان کنندہ ارادی/ قاری بھی منشایاد۔ منشایاد بدن بھی ہے اور بدن میں کسماتا ضمیر بھی۔ وہ اجتماع بھی ہے اجتماعی شعور بھی، اپنا باپ بھی اپنا بیٹا بھی''۔(۵)

اور ٹائم میں افسانہ نگار نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ موقع چاہے خوشی کا ہو یا سوگ کا دولت کو ہی بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ طبقاتی بعد کی ایک اور دلچسپ کہانی، کہانی کی بناوٹ میں پیوست ہوتا طنزیہ اور زہر خند سے زیادہ ڈرامائی لہجہ کہانی کا مرکزی کردار جی۔ایم صاحب کی والدہ کے انتقال کی خبر سن کر جب اُن کے گھر جاتا ہے تو تعزیت کرتے، نماز جنازہ پڑھتے، میت کو کندھا دیتے اور قبر میں اتارتے ہوئے وہ برابر اس کوشش میں رہتا ہے کہ بڑے صاحب کی اُس پر نظر پڑ

جائے اور جب وہ اپنی اپیل کے سلسلے میں اُن کے پاس حاضر ہو تو وہ انہیں یاد آ جائے کہ اس نے ان کی والدہ کے جنازے میں شرکت کی تھی۔ مگر بلند قامت لوگوں کو اتنے کوتاہ قد آدمی کہاں دکھائی دیتے ہیں وہ اس ساری صورت حال سے سخت شرمندہ ہوتا ہے کہ وہاں سب امیر کبیر لوگ ہیں۔ وہ چاروں طرف سے ان انیس (۱۹)، بیس (۲۰)، اکیس (۲۱) اور بائیس (۲۲) گریڈ والے افسروں میں گھرا ہوا واحد معمولی کلرک ہے۔ اور اپنا کام نکلوانے کے لئے بڑے صاحب کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اُسلوب شگفتہ اور رواں ہے۔ کہانی وحدت تاثر کی حامل ہے۔ دفتر سے جی۔ ایم کے گھر جانے کے دوران میں مرکزی کردار اپنا کچھ وقت باہر گزارتا ہے مگر کہانی کا تاثر قائم رہتا ہے۔ انجام چونکا دینے والا ہے۔

"دعا کے بعد جی ایم صاحب بلند قامت لوگوں کے ہمراہ کار کی طرف چلے گئے اور وہ گم صم قبر پر کھڑا رہ گیا لیکن پھر ایک شخص جو گورکنوں کو پیسے دے رہا تھا اسکی طرف آیا اور اس کے ہاتھ پر پانچ روپے کا نوٹ رکھ دیا۔"

لڑکپن اور آغاز جوانی کی درمیانی عمر کے خیالات و جذبات پر لکھا گیا افسانہ ہے۔ کہانی کا آغاز کچھ اس طرح ہوتا ہے۔ کئی روز سے سخت بیمار ہوں، بچنے کی اُمید کم ہے، مرنے سے پہلے کہا سنا معاف کرانا چاہتی ہوں، خدا کے واسطے مایوس نہ کرنا تھوڑی دیر کے لئے چلے آنا تاکہ میں سکون سے مر سکوں۔"

یہ اُس خط کا مضمون ہے جو کہانی کے " میں کو اسکی ماموں زاد جنت نے لکھا ہے۔ "میں" کی بیوی فرزانہ، جنت کے بارے میں پوچھتی ہے تو وہ بتاتا ہے یہ وہی جنت ہے جس نے مجھے آٹھویں جماعت کے وظیفے کے امتحان میں فیل کرایا تھا اور ساری برادری میں بدنام کرا دیا تھا میں اُس ذلت کو کئی سالوں بعد بھی ویسی ہی شدت سے محسوس کرتا ہے اور جانے سے انکار کر دیتا ہے۔ مگر فرزانہ کے کہنے اور حقیقت جاننے کی خواہش کی وجہ سے وہ جانے پر راضی ہو جاتا ہے مگر اُس کے جانے سے پہلے گاؤں سے جنت کے مرنے کی اطلاع آ جاتی ہے۔ یوں یہ راز جنت کے ساتھ مٹی میں دفن ہو جاتا ہے۔ اوائل بلوغت کی نفسیاتی کیفیت اور ذہنی انتشار کا شکار، اس کہانی کا کردار اندھیرے میں بڑی گہرائی سے تاریک

Al-Behishat Research Archive
https://al-behishat.rjmss.com/index.php/20/about

ماحول کا جائزہ لیتا ہے۔اور ذہن میں اترنے والی مختلف آوازوں کے مطلب کھوجتا رہتا ہے اور یکسوئی سے پڑھ نہیں پاتا اور فیل ہو جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔وزیر آغا، محمد منشایاد شخصیت اور فن از اسلم سراج الدین(کراچی: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۰ء) ص ۱۶۸

۲۔حمید شاہد، منٹو، جنس اور منشایاد(دیلی سہ ماہی ادب ساز، جلد نمبر ا، شمارہ نمبر ۱۲ ۲۰۰۶ء) ص ۱۴۷

۳۔مظفر علی سید، منشایاد۔۔کاریگر افسانہ نگار (کراچی: ماہنامہ قومی زبان، جلد نمبر ۶۲، شمارہ نمبر ا، جنوری ۱۹۹۰ء) ص ۵۸

۴۔مظفر علی سید، منشایاد۔۔کاریگر افسانہ نگار (کراچی: ماہنامہ قومی زبان، جلد نمبر ۶۲ شمارہ نمبر ا، جنوری ۱۹۹۰ء) ص ۵۸

۵۔اسلم سراج الدین، م۔ح۔م۔د منشایاد، شخصیت اور فن(کراچی: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۰ء) ص ۱۷۲